ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.6 No.1 2022

رشید امجد کے افسانوی مجموعہ "ایک عام آدمی کا خواب" کا فکری جائزہ

محمد حسن فرید ، ایم فل سکالر ، شعبہ زبان و ادبیات اردو، پنجاب یونیورسٹی لاہور۔
ڈاکٹر عائشہ سلیم، اسسٹنٹ پروفیسر ، شعبہ اردو جی سی یونیورسٹی لاہور

ABSTRACT:

Rashid Amjid is a well known Pakistani Urdu fiction writter, criticism and scholar. He was also an editor of literary Urdu research magazines Dryfit and , Takhleeqi adab,. He wrote his autobiography, Aashiqi sabr Talab,, and ,, Tamana Betab,,. He prouided many short story of books to urdu litrerature as " Bezar Aadam Ke Bete" , " Akse bekhyal", Pat jhar mein khud kalami " and " Ek aam Admi ka khawab" etc. His short stories discuss the political issues and " Marshal law" Problems of Pakistan. His short story book " Ek aam admi ka khawab" discribes the main problems of citizen as the identity , proverty, selfishness and society .

***Keywords**: Rashid Amjid, Pakistani, criticism, short story writter, Marshal law, Politic, Symoblist.*

رشید امجد کا شمار اردو ادب کے مایہ ناز ادیبوں میں ہوتا ہے افسانہ نگاری میں آپ کا خاصا علامتی انداز بیاں ہے۔آپ کے پہلے مجموعے" بیزار آدم کے بیٹے " سے لے کر آخری افسانوی مجموعہ" کہانی نے خواب دیکھا" تک سبھی افسانوں میں سماج کے نچلے طبقے کے بے شناخت کرداروں کی ترجمانی ملتی ہے۔ ایسے کردار جو ساری زندگی عام سے خاص بننے کی جستجو اور حسرت میں گزار دیتے ہیں۔مگر ہمارا معاشرہ انہیں اعلیٰ مرتبہ دینا تو کجا ان سے اپنی حقیقی شناخت بھی چھین لیتا ہے۔زیر بحث افسانوی مجموعہ " ایک آدمی کا خواب" 2006 ءمیں حرف اکادمی میں راولپنڈی سے شائع ہوا۔جس میں کل 22 افسانے ہیں۔ان افسانوی کرداروں کا بھی بنیادی مسئلہ شناخت کا مسئلہ ہے۔یہی وجہ ہے کہ اکثر کردار رشید امجد نے بے نام شامل کیے ہیں۔جیسے "بگل والا" ایک عام آدمی" گملے میں اگا ہوا شہر اور " پونے آدمی کی دوسری کہانی" وغیرہ۔

ان افسانوی مجموعہ میں عام آدمی کے خواب، سیاسی حکمرانوں کی چال بازیوں، مارشل لاءکی صعوبتوں حکام بالا سے غریب عوام کی وابستہ امیدوں، جدت وقدامت کے متفرق پہلوئوں اور دور حاضر کے غیر مخلصانہ رویوں سے پردہ اٹھایا گیا ہے۔

"بگل والا "کی کہانی معاشرے کےاس فرد کی کہانی ہے جو معاشرتی ترقی میں اپنا بھرپور حصہ ڈالتا ہے۔مگر اس کی حیثیت ایک "بگل چی " کی سی ہی رہتی ہے۔جب فوجی چھائونی میں منعقدہ تقریب میں اسے مدعو کیا جاتا ہے تو وہ افسروں کی بیگمائوں کے ساتھ اپنی بیوی کو دیکھنے کا خواہاں ہوتا ہے۔وہ بگل چی جس کے بگل بجنے پر پوری فوجی پلٹون تیار ہو کر ایک میدان میں آ کھڑی ہوتی ہے کیا اس کی اتنی حیثیت نہیں کہ اس کی بیوی ان فوجیوں کی بیویوں کے ساتھ بیٹھ سکے؟؟

مگر اس مغالطے کا احساس بگل والے اور اس کی بیوی کو اس وقت ہوتا ہے جب سب سے پہلے پہلی نشست پر براجمان ہونے کے باوجود اسے اس بنا پر آخری نشست پر بھیجا جاتا ہے کہ وہ ایک بگل چی کی بیوی ہے۔وہ بگل چی جو سردی کی ٹھٹھرتی راتوں میں اٹھ کر سبھی کو بیدار کرتا ہے مگر مفلسی ایسی کی شادی کے وقت کا رکھا ہوا ایک جوڑا اس تقریب میں پہننے کے لیے نکالا جاتا ہے۔یہاں رشید امجد اشتراکیت کے تصور کے ترجمان نظر آتے ہیں۔جو طبقاتی کشمکش کونہ صرف نا پسند کرتے ہیں، بلکہ افسانے کے آخر میں بگل بردار سے بے وقت کا بگل بجوا کر ایک مزاحمتی انتقام بھی بے حس سماج سے لیتے ہیں۔جو ان کی محنت کی اجرت اور زندگی کی خوشیوں کا غاصب ہے۔بقول ناصر عباس نیر؛

> " بگل والا" اپنی بالائی سطح پر ایک عام سپاہی کی عزت نفس کے مجروح ہونے اور اس کی بحالی و اثبات کی جرات مندانہ کوشش سے عبارت ہے جبکہ زیریں سطح پرشناخت کے مغالطے کی کہانی ہے۔۔۔۔وہ بگل کو

اپنے اظہار کا وسیلہ سمجھتا ہے۔وہ اپنی تذلیل جو طاقت کے میں اسے آئینہ دکھانے کا عمل تھا۔پر احتجاج کے لیے بھی بگل کو ذریعہ بناتا ہے۔" (۱)

"ایک عام آدمی کا خواب"کا عام آدمی بھی ویسا ہی خواب رکھتا ہے جو غلام عباس کے افسانے "کتبہ "کا شریف حسین دیکھتا ہے۔ایسا خواب جو پوری زندگی وہ اپنی پلکوں میں سجاکر جہد مسلسل میں رہتا ہے مگر اس کی تعبیر اس کے مقدر میں نہیں کیونکہ وہ ایک سماج کا عام آدمی ہے۔رشید امجد نے اپنی زندگی میں چار مارشل لاءدیکھے۔مارشل لاءپر عوام بہتری کی منتظر ہوتی مگر نیا آنے والا حکمران پہلے سے بھی زیادہ قوم کیلئے وبال جان بن جاتا۔''ایک عام آدمی کا خواب" افسانہ کے ذریعے افسانہ نگار نے ماضی وامروزکی تصویر کشی کی ہے۔ہر نیا حکمران نئے نظریے، نئے ایجنڈے کے ساتھ وارد ہوتا ہے۔ووٹ کے حصول کے لیے قوم کو روٹی،کپڑا،مکان کی فراہمی کی یقین دہانی کرائی جاتی ہے۔مگر ہر نیاحکمران روایتی ڈگر پر چل کے اپنے مفاد کا راستہ نکالتا ہے۔اسے فقط اپنی تجوری بھرنے سے غرض ہوتی ہے۔رشید امجد کا یہ عام آدمی کھرے سکوں کی طلب میں ایک بار پھر اپنی جیب کھوٹے سکوں سے بھر بیٹھتا ہے۔اپنے ووٹ کے ذریعے حکمران منتخب کرنے کے بعد عام آدمی انقلاب اور تبدیلی کے خواب دیکھتا ہے۔مگر ان کے دیکھے ہوئے خواب بھیانک تعبیر کی صورت دھار لیتے ہیں۔ایک طرف مہنگائی تو دوسری جانب ذرائع آمدن کے مسائل۔ہر آنے والی حکومت غریب عوام کو مسائل کی چکی میں پیس کر رکھ دیتی ہے۔عام آدمی کے خواب، خواب ہی رہتے ہیں اور نسل در نسل ان کا انتقال ہوتا رہتا ہے۔رشید امجد ان خوابوں سے متعلق اپنی کلیات ایک عام آدمی کے خواب کے تعارفیے میں رقمطراز ہیں :

" یہ کہانیاں ایک عام آدمی کے وہ خواب ہیں جو اس نے زندگی بھر دیکھے لیکن تمام تر جدوجہد اور خواہشوں کے باوجود تعبیر نہ پا سکے کیونکہ وہ ایک عام آدمی تھا ایک عام آدمی کے گھر پیدا ہوا جیا اور ایک عام آدمی کی حیثیت سے مر گیا۔" (۲)

وہ عام آدمی جس کی جدو جہد سے معاشرہ ترقی کی منازل طے کرتا ہے۔وہ عام آدمی جس کی بدولت ارباب حکومت کے ہاتھ میں ملکی باگڈور آتی ہے، جب اس دنیا سے کوچ کرتا ہے تو اس کے جنازے میں شریک لوگ بھی خاص نہیں بلکہ عام آدمی ہی ہوتے ہیں۔یوں عام آدمی کا خاص بننے کا خواب اس کی اگلی نسل میں منتقل ہو جاتا ہے۔رشید امجد ایک ایسا معاشرہ دیکھنے کی خواہاں ہیں جہاں طبقاتی کشمکش کا سدباب ہوہر۔ایک کوبلا امتیاز حقوق میسر ہوں۔عام اور خاص کا فرق ختم ہو۔غربت و افلاس اور ظلم و بربریت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو۔جب عوام امیدوں کے سہارے جینے لگتی ہے تو رشید امجد جیسے حساس شخص کے لئے یہ محرومی بے بسی نارسائی اور استحصالی نظام میں مسلسل قرب بن کر سامنے آتا ہے۔"بے زمیں" اور "بے شناخت "افسانے عصر حاضر کے فرد کے بے شناخت ہوجانے کی عکاسی کرتے ہیں۔زندہ ہونے کے باوجود اپنے مرکز اور شناخت کو یہ کردار کھو بیٹھتا ہے۔رشید امجد کا شمار ان افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جو اپنے نئے وطن کے حصول کی خاطر بے گھر ہوئے۔راہزنوں سے تو وہ بچ نکلے مگر رہبروں نے انہیں گھیر لیا۔ہمارے آباؤ اجداد نے وطن اس لیے حاصل کیا کہ ہم وہاں متحد ہو کر رہیں۔مگر افسوس صد افسوس کہ ہم نے اپنا شیراز مزید بکھیر دیا۔کہانی میں ایک بے نام فرد اپنی ماں کی تصویر کا متلاشی ہے۔اس کے پاس اور تصاویر تو بہت سی ہیں مگر اپنی ماں کی نہیں۔"بے زمیں" کی طرح" بے شناخت" میں بھی بنیادی مسئلہ پہچان ہی کا ہے مگر فرق صرف اتنا ہے کہ "بے زمیں" میں اسے ماں کی پہچان کا سراغ تک نہیں ملتا جب کہ "بے شناخت" میں تصویر تو ہاتھ آتی ہے مگر ذہنی انتشار اور متفرق افکار اسے اس پہلو سے گریز اں رکھتے ہیں کہ وہ اپنے قلب سے اپنی ماں کی تصویر کی نشاندہی کر سکے۔

وطن کو ماں بھومی بھی کہا جاتا ہے۔جوں بچہ ماں کی آغوش میں سکون محسوس کرتا ہے یوں ہی ایک بے وطن اپنے دیس میں اپنائیت وتسکین پاتا ہے مگر یہاں اپنے وطن میں بھی اپنائیت کا احساس مفقود ہے۔جن مقاصد کے لئے اس وطن عزیز کو حاصل کیا ہم نے انہیں فراموش کر دیا ہم نہ تو اپنا مذہبی و نظریہ تفاوت مٹا سکے اور نہ ہی یکجا ہو سکے جس کے باعث ہم نے اپنا تشخص کھو دیا۔جب پاکستان وجود میں آیا تو قائد اعظم نے کہا کہ تم سب آزاد ہو یہاں۔اپنی مسجدوں میں جانے کے لیے ، اپنے میں مندروں میں جانے کے لیے ،اور جہاں جانا چاہو۔مگر افسوس کہ ہم نے قیام پاکستان کی روح اور مقصدیت کو گم کر دیا۔اعجاز احمد رشید امجد کے اس تلخ موضوع کی ان الفاظ میں نشاندہی کرتے ہیں۔

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.6 No.1 2022

" ہمارے کہانی کار کی اس کہانی کا موضوع دکھ ہے۔"بے زمیں" ہوجانے کا دکھ۔۔۔۔۔۔پیڑوں کو اپنے پائوں پر کھڑا ہونے کے لیے زمین درکار ہے اور ان کی بلندی اور رفعت زمین ہی کی بدولت ہے۔زمین جو بڑوں کی جڑیں تھا میں رہتی ہے جیسے جیسے زمین ان کی جڑوں کو اپنے اندر سمو دی جاتی ہے ویسے ویسے پیڑبلند ہوتے جاتے ہیں۔ پیڑ کا زمین یعنی اپنی ماں سے رشتہ جس قدر مضبوط ہوگا پیڑ اس قدر مضبوط اور توانا ہوگا۔ پیڑ جس طرح زمین کی کوکھ سے جنم لیتا ہے۔زمین(دھرتی) اور ماں ایک سطح برابر کا درجہ رکھتی ہے اگر ان کی شناخت مشکوک۔۔۔۔۔۔۔نہیں۔۔۔۔نہیں ان کی شناخت مشکوک نہیں ہونی چاہیے۔ (۳)

دور حاضر میں ہماری شناخت مشکوک ہی نہیں بلکہ تقریبا ختم ہو چکی ہے۔کہاں قائد اعظم کا عطا کردہ پاکستان اور کہاں آج کا پاکستان۔پاکستان بننے کے بعد پاکستان کی سر زمین اور اس کے باسیوں پر پہلا ظلم" سقوط ڈھاکہ" کا ڈھایا گیا۔اتنا بڑا نقصان اٹھا کر کچھ نہ کچھ سیکھ جانا چاہیے تھا۔مگر قابل تعصب بات یہ کہ انفرادی اور ملکی شناخت کا دیرینہ سلسلہ جاری رہا۔وہ قوم جس نے ہندوئوں سے مذہبی اور نظریاتی تفاوت کی بنا پر ایک الگ ریاست حاصل کی ،مختلف فرقوں میں بٹ گئی۔ہم نے ریاستی شناخت کو بالائے طاق رکھ کر مسلک میں جاکر پناہ لی۔سنی، شیعہ، دیوبندی اور وہابی کے مختلف احزاب میں خود کو منقسم کر کے اپنا شیرازہ بکھیر دیا۔ہم ذاتی منفعت کے پیش نظر تو رات دن میں محنت شاقامیں محو ہیں مگر اجتماعی منفعت کو خاطر میں نہ لاکر پستی و تنزلی کی جانب لڑکھتے چلے جا رہے ہیں۔ہمیں رنگ، نسل ،قوم ، مسلک ، تہذیب اور کلچر سے بالاتر ہو کر ملکی مفاد کے لئے کوشاں ہونا چاہیے۔ابن خلدون نے کہا تھا کہ انسان کا مقصد یہ ہے کہ وہ معاشرے میں انصاف لے کر آئے۔یہ انصاف صرف ظلم تک ہی محدود نہیں بلکہ سیاسی ،معاشرتی ،معاشی، مذہبی، اقتصادی اور بلاآخر انسانی سطحوں کی منازل بھی طے کرے۔رشید امجد کے افسانوں کا عام آدمی مذکورہ تمام سطحوں پر اپنی پہچان کھو کر بے شناخت معاشرے میں بھٹک رہا ہے۔

بقول صفیہ عباد:

"تمام عوامل اس سے اس کی پہچان چھین لیتے ہیں۔کون؟۔۔۔کیسے؟؟؟۔۔۔کدھر؟؟؟۔۔اور کیوں کی گردش میں گھوم رہا ہے۔گھر کے اندر ،باہر شناخت، گمشدگی کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے۔یہاں گمشدگی اور شناخت کا مسئلہ فرد کے حوالے سے بھی دو طرح کا ہے۔ایک خارج کا دوسرا داخل کا۔خارج کے حوالے سے وہ بے توقیری کا احساس ہے جو فرد سے اس کی شناخت چھین رہا ہے۔داخل کے حوالے سے فرد ان اخلاقی قدروں کی زوال پذیری پربے شناخت ہوتا جاتا ہے جو کبھی اس کی پہچان بنتی تھی۔"(۴)

رشید امجد کے عام آدمی کی شناخت کا یہ مسئلہ مختلف جہات سے ہمارے سامنے آتا ہے اپنی ذات سے اس کا آغاز ہوتا ہے اورپھر اجتماعی حوالے سے اسکی ضرورت ابھرتی ہے خارج کی متصادم قوتوں کے درمیان پستا ہوافرد اپنے وجود کے ہونے ، نہ ہونے کے یقین اور بے یقینی کی زد میں ہے۔شکوک و شبہات کے درمیان وہ گھرا ہوا نظر آتا ہے۔"بلیک ہول" افسانہ بھی لاحاصلیت یا بے معنویت عکاس ہے۔انسان اپنی منزل کا تعین کرتا ہے تو دورانے سفر اسے کئی مشقتوں گزرنا پڑتا ہے۔کئی لایعنی پہلو اس کی دلچسپی کو اپنی جانب مبذول کرتے ہیں۔مگر کامیابی تبھی مقدر ٹھہرے گی جب وہ مسلسل سعی کے ذریعے اپنی منزل کی طرف سفر جاری رکھے۔اگر اگر منزل کو آسان جان کر خرگوش کی طرح سست روی اپنا لی جائے تو پھر فتح سے ہمکنار ہونا ناممکن ہو جاتا ہے۔

زیر بحث افسانہ کا کردار بھی یہی سوچتا ہے کہ ابھی بھی وقت ہے لہٰذا جنازہ میں شرکت کر لی جائے۔اپنے راستے سے جدا ہونا نہ صرف اسے منزل سے بھٹکاتاہے بلکہ لمحہ موجود سے بھی اسے بے خبر کر دیتا ہے۔ہماری قوم کا بھی یہی المیہ ہے کہ یہ مرکز سے ہٹ کر متعلقات سے اپنا رشتہ استوار کرتی ہے۔جس کی بدولت اس کا درخشندہ فردہ بھی ظلمت کدہ ثابت ہوتا ہے۔یونہی علامتی پیرائے میں لکھے گئے اس افسانے کا موضوع بھی آدمی کا، لا یعنی باتوں میں

دلچسپی لینا ہے۔رشید امجد نے اس معنی کی ادائیگی کے لیے "بلیک ہول "کی علامت استعمال کی ہے۔بلیک ہول مادے کی ایک بے پناہ ومرتکز ایسی حالت ہے جس کی وجہ سے اس کی کشش ثقل اس قدر بلند ہوجاتی ہے کہ کوئی بھی شئے اس کے افقِ وقیعہ سے فرار حاصل نہیں کرسکتی۔آسان لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہ کہکشاوں میں موجود ایسی شئے ہے جو ہر چیز کو اپنی جانب کھینچ لیتی ہے۔بڑی سے بڑی طاقت ور شے بھی اس کے اندر جا کر اپنا وجود کھو بیٹھتی ہے۔آدمی گھر سے اپنی منزل کا تعین کرکے نکلتا ہے مگر راستے میں جنازہ میں شرکت اور میت کی تدفین کرنے سے وہ نہ صرف اپنا راستہ بھٹک جاتا ہے بلکہ ایک ایسے جہاں میں جا پہنچتا ہے جس کا زمانہ ایک ہزار سال قبل کا ہوتا ہے۔جب واپس اپنی دنیا میں وارد ہوا تو کوئی اسے پہچاننے والا نہ تھا۔

افسانے کا دوسرا پہلو معاشرتی و سیاسی جبر بھی ہو سکتا ہے۔گھر سکون کی علامت لیں تو یہاں گھر کے معنی ایک اس حکمران کے سے بھی ہو سکتے ہیں جن کو مسیحا جان کر عوام سکون کی متلاشی بنتی ہے اور ان کو اقتدار میں لے آتی ہے۔"بلیک ہول" کے کردار کے بٹوے میں موجود پیسوں کا بے کار ہونا اور اپنی حیثیت کھونے کو معاشی بدحالی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ہر آنے والا حاکم پہلے کی نسبت زیادہ ہی عوام کے لیے مہنگائی لے کر آتا ہے۔یوں سیاست کی طرف بھی یہ افسانہ اشارہ کرتا ہے۔

ڈاکٹر فردوس انور قاضی کے مطابق:

> "ان کے افسانوں میں ایک ایسا کردار نظر آتا ہے جو گھر کا راستہ بھول گیا ہے۔جس کے گھر کے دروازے بند ہیں یا جسے کوئی نہیں پہچانتا۔دراصل علامتی انداز میں یہ آدمی کی موت کا اعلان ہے جب بظاہر زندہ ہے لیکن اندر سے مر چکا ہے۔وہ اپنے اردگرد لاتعلق ہوا جا رہا ہے۔کسی کو اس کی گمشدگی، اس کی موت کا احساس نہیں ہے یہ تمام چیزیں موجودہ عہد کی معاشی، سیاسی اور معاشرتی جبر کی علامتیں ہیں۔" (۵)

جب عوام محنت مزدوری کر کے بھی بھوکی سونے لگے اور مہنگائی اس قدرہو کہ سماج کا نامولوداور نومولود بچے بھی مقروض ہو جائیں تو یہ ایک عام آدمی کے لیے موت ہی کے مماثل ٹھہرتا ہے۔ان کا جینا مرنا یکساں قرار پاتا ہے۔جب سماج اسے لاتعلق کر دے۔اس کی شناخت مسخ کر دے یااس کا وقار مجروح کرے تو ایک عام آدمی موت اور قبر ہی کو اپنی آسودگی کا سامان سمجھنے لگتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ رشید امجد کے ہاں موت اور قبر کے استعارے یا علائم بکثرت مستعمل ہیں۔

رشید امجد کے افسانوں میں ایک عام آدمی کو پیش شناخت کا مسئلہ صرف سیاسی یا سماجی ہی نہیں بلکہ مذہبی سطح پر بھی ہمارے سامنے آتا ہے۔" گملے میں اگا ہوا شہر"۔۔۔۲" افسانہ اس پہلو پر صراحتاً دلالت کرتا ہے۔یہ افسانہ اپنے استعاراتی علامتی اسلوب کی بنا پرتہہ دارہے۔اس کی کہانی دور حاضر کے لوگوں کی تنگ نظری اور فرقہ پسندانہ عقائد کی علامتی پیرائے میں نقاب کشائی کرتی ہے۔ایک میت کا جنازہ کھو جانا صرف جنازہ کھو جانا ہی نہیں بلکہ وصف انسانی کا فی الحقیقت گم ہونا ہے۔لوگ انسانیت کی بجائے عقائد ،مسالک اور ذاتی آغاز کو مطمع نظر بناتے ہیں۔یہ زندگی کے وہ تلخ حقائق ہیں جنہیں معاشرہ کا قبول کرنا تو درکنار سننا بھی گوارا نہیں۔رشیدامجد سماجی مذہبی اور انسانی اقدار کو پامال ہوتا دیکھتے ہیں تو انہیں اپنے افسانوں کا حصہ بناتے ہیں۔افسانے میں دیکھا یاگیا ہے کہ جو آدمی اس کے جنازے میں شریک تھے وہ اس کی صحت کی باتیں کرنے کے ساتھ ساتھ موت کے منتظر تھے۔یوں رشید امجد ہمارے سماج کے منافقانہ رویہ کا سراغ جا بجا لگاتے نظر آتے ہیں۔جنازے کی تلاش اور میت سے لاتعلقی ہم قدم ہم رکاب چل رہی تھی۔سماجی رکھ رکھاؤ تو اسے مجبور کر رہا تھا کہ میت کی آخری رسومات کی ادائیگی میں شریک ہو مگر مسلک اور تنگ نظر کے کی زنجیر اس کے قدم کھینچ رہی تھی۔

افسانہ نگار کا دوسرا گہرا طنز مسجدوں پر ہے۔ہر مسجد کے دروازے پر کسی نہ کسی مسلک کی تختی آویزاں تھی۔رشید امجد کے اندر کا انسان یہاں سخت مزاحمتی انداز اپناتا ہے کہ جب خدا ایک ،رسول ایک، کتاب ایک، یہاں تک کہ شریعت بھی ایک ہے تو پھر اسلامی جمہوریہ پاکستان کے لوگ کیوں بکھرے ہوئے ہیں؟؟؟ کیوں کہ ایک مسلک کا شخص مخالف مسلک کے امام کے پیچھے نماز نہیں پڑھتا؟؟؟ وہ کس منہ سے تبلیغ کرنے کے حقدار ہیں جو بات بات پر فتاویٰ کا صدور کرتے ہیں۔خنجر عداوت ہی نکالتے ہیں اور ایک دوسرے کے ہی دست و گریباں ہو کر تہ تیغ کرتے ہیں؟؟؟ جنازہ کی شناخت فی

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.6 No.1 2022

الحقیقت اپنے آپ کی شناخت ڈھونڈنا ہے۔جو کٹھن ہی نہیں بلکہ ہم نے ناممکن بنادی ہے۔رشید امجد کے پیش کردہ کرداروں کا وجود انحطاط پذیر معاشرے میں ریزہ ریزہ ہو کر بکھر چکا ہے۔وہ اپنی شخصیت کا تعین کرنا چاہتے ہیں تاکہ اپنے وجود کو معنویت دے مگر یہ اتنا آسان نہیں۔

جنازہ گم ہونے سے مراد انسانیت کا درجہ پر جانا ہے۔آئے روز ہمیں ایسے کئی واقعات دیکھنے کو ملتے ہیں جن سے انسانیت بھی کانپ اٹھتی ہے مگر خود انسان نہیں۔اس تناظر میں ہم زینب اور ان چھوٹی بچیوں کو دیکھ سکتے ہیں جو آئے روز انسانی ہوس اور درندگی کا شکار ہوتی ہیں۔یہ جنازہ گویا سماجی زوال کی بدترین شکل ہے۔بے حسی کا کارواں چل رہا ہے۔یہ زوال رفتہ رفتہ معاشرتی، معاشی اور اخلاقی سطح پر نمودار ہے۔زیر بحث افسانہ میں سولی چڑھنے والے آدمی کے متعلق لوگوں کا جو رویہ افسانہ نگار نے ہمارے سامنے رکھا ہے وہ اپنے اندر کرب کی پوری داستان سموئے ہوئے ہے۔آئے روز مظلوم پر ظلم و تشدد کے پہاڑ ٹوٹ رہے ہیں مگر لوگ محض تماشائی بنے ہوئے ہیں۔تماشائیوں کی خاموشی ظالم کی تائید کے مترادف ہے۔دنیا میں حق گو کو قتل کرنے اور راست بازی کے خاتمے کے المیے کی طرف یوں اشارہ کیا گیا ہے۔

"اب تو یاد بھی نہیں رہا ایک نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ہم نکلے کب تھے اور کس لیے تمہیں کچھ پتہ ہے
اس نے ساتھ والے سے پوچھا اس نے نفی میں سر ہلایا۔شاید اسی کو پتہ تھا جس کا جنازہ ڈھونڈ رہے ہیں۔تو
سارا اتہ پتہ وہ اپنے ساتھ لے گیا ایک نے دوسرے سے کہا۔اور خود بھی گم۔گیا دوسرا ہنسا۔"۶

کہانی کے آغاز اور وسط میں دکھایا گیا کہ جنازہ گم ہوگیا ہے اور لوگ اس کے متلاشی ہیں مگر مل نہیں رہا۔افسانے کے آخر میں دکھایا گیا ہے کہ شہر میں ہنگامے اپنے عروج پر ہیں۔سڑک کے کنارے پڑا جنازہ کسی کو دکھائی نہیں دے رہا اور نہ ہی اس سے اٹھنے والی تعفن کسی کو محسوس ہو رہی ہے۔سڑک علامت ہے آمدورفت کی جبکہ جنازہ میں دلچپی نہ لینا مقتول کے ورثاءکو تنِ تنہا اور بے یارو مددگار یار چھوڑ دینا ہے۔

ابتداً ورثاءکو امید بندھائی جاتی ہے کہ آپ مطمئن رہیں ہم اس ظلم کا بدلہ ضرور لیں گے۔مگر بات جونہی پرانی ہوتی ہے تو یہ معاملہ بھی بے حس لوگوں کے لئے دلچسپ اور عام ہوجاتا ہے۔ورثاکوٹ کچہری کے چکر لگاتے ہیں مگر انہیں انصاف نہیں ملتا۔لوگ ایسے ہیں انہیں نظرانداز کرتے ہیں جیسے سڑک پر پڑے جنازے کو۔

کسی بھی شے کا اپنی اصل سے رشتہ جس قدر مضبوط ہوگا وہ اسی قدر نشونما پائے گی۔کسی درخت یا پودے کی جڑیں زمین میں جتنی گہری ہو گی اسی قدر وہ تناور اور مضبوط بنے گا۔اگر کسی پودے کی جڑیں گملے میں محدود مٹی سے وابستہ ہوگئی تو وہ پودا ہی کہلائے گا تناور درخت نہیں۔یہی وجہ ہے کہ افسانہ نگار نے قومی اتحاد اور شیرازہ بندی کو گملے میں اگے ہوئے شہر سے تعبیر کیا ہے۔انفرادی طور پر اپنی شناخت پر نازاں ہیں مگر اجتماعی ساکھ ان کی ختم ہو چکی ہے۔

رشید امجد کی علامت کے پیرائے میں بڑی بڑی بات کہہ جاتے ہیں۔انہوں نے اپنے اس افسانوی مجموعہ "ایک عام آدمی کا خواب "میں بہت سے علامتی افسانوں کے ذریعے قیامِ پاکستان کے بعد کے حالات قاری کے سامنے رکھے ہیں۔اس کے ساتھ وہ ملکی قانون سازی کو بھی استعاراتی انداز میں بیان کرتے نظر آتے ہیں۔افسانہ" کھیل" اور سکرپٹ" انہی موضوعات کی عکاسی کرتے ہیں۔"کھیل" افسانہ میں افسانہ نگار ایک فلمی تھیٹر کی کاروائی اور مینجر کی بے بسی کے ذریعے حکومت کا وہ کھیل سامنے لاتے ہیں جو کہ گذشتہ 70 سالوں سے اس عوام کے ساتھ کھیلا جارہا ہے۔تھیٹر سے مراد یہ دیس ، کھیل سے مرادکے حکومتی چال چلن ،جبکہ مینیجر سے مراد وہ حکام ہیں جو اپنی مرضی سے کھیل پیش کرنے کے قائل ہیں۔

کوئی بھی کھیل باہمی مشاورت ہی سے کامیاب ہوتا ہے۔اس کے برعکس اگر افراتفری، من مانی اور "میں کھیل اپنی مرضی سے چلا جائوں گا " جیسے نظریات زور پکڑنے لگیں تو اس کھیل کا شیرازہ بھی بکھرتا ہے اور فتوحات کی بجائے شکست و ذلت مقدر ٹھہرتی ہے۔اس پورے" کھیل" کی کہانی جہاں پاکستانی طرزِ حکومت کو بیان کر رہی ہے وہیں اس کا اطلاق ایک ایسی قوم پر بھی ہوتا ہے جو ہمیشہ سے حکام بالا کے ظلم و بربریت کا نشانہ بن کر اسیری

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.6 No.1 2022

کی زندگی گزار رہی ہو۔اس کہانی میں مینیجر کا بدلنا حقیقت میں پاکستانی حکمرانوں کی کم عرصہ میں تبدیلیوں سے تعبیر ہے۔ہندوستانی وزیر نے کہا تھا کہ میں اتنی جلدی اپنی دھوتی نہیں بدلتا ،جتنی جلدی پاکستانی حکومت بدل جاتی ہے۔

اگر ہم اپنی سیاسی تاریخ پر نگاہ دوڑائیں تو ایسا حکمران ملنا مشکل ہے جس نے عوام کی پسند کا کھیل چلایا ہو۔رشید امجد نے اپنے فنی سفر کے آغاز سے لے کر وفات تک چار مارشل لاءدیکھے۔ جہاں جمہوری حکومت کی من مانیوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا، وہیں آمریت میں ڈکٹیٹرز کے جبری تسلط کو بھی اپنے فن میں جگہ دی۔انھوں نے بغور مشاہدہ کیا کہ جواب طلبی کرنے والے شخص سے ریاست کیا سلوک کرتی ہے۔اسے مارپیٹ کر دوسروں کے لئے نشان عبرت بنایا جاتا ہے۔تاکہ آئندہ کوئی انگشت اٹھا کر مقتدرہ کے امور میں دخل کا باعث نہ ٹھہرے۔کھیل فسانہ یں پہلے افسانہ میں اس جبر اور بے بسی کی کیفیات میں کو کچھ اس انداز میں بیان کیا گیا ہے

سٹیج پر تھیٹر کے باوردی ملازم نمودار ہوئے اور کود کر ہال میں آگئے۔حتجاج کرنے والا اپنی جگہ پر کھڑا تھا۔انہوں نے اچھل کر اسے دبوچ لیا اور گھسیٹتے ہوئے ہال سے باہر لے گئے۔

جب سوال کرنے پر حکمران کی طرف سے ظلم و بربریت کا نشانہ بنایا جائے تو ایسی صورت میں آپ سوچ سکتے ہیں کہ ایک ادیب کے لیے مسائل کو کھلم کھلا بیان کرنا کس قدر مخدوش ہو جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ رشید امجد نے سنگین حالات میں علامت سازی کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا ہے۔احمد جاوید اس حوالے سے رقم طراز ہیں:

”رشید امجد کو اپنے فنی سفر کا آغاز پر ہی ایوب خان کے مارشل لا کا سامنا ہو گیا تھا اس کے بعد سقوط ڈھاکہ کے باقی نے آدم تشفی کا کبھی مسئلہ پیدا کیا اس کی نزاکت آ بنایا ہوا تو پھر اسی زنجیر کی کڑیاں تھی“ (۸)

افسانے کا دوسرا پہلو” سقوط ڈھاکہ“ کی عکاسی کرتا ہے۔کہانی میں دیکھایا گیا ہے کہ مینجر تماشائیوں کو جنگ کے مناظر دکھانے پر معر ہے مگر تماشائی اس سے انکار کرتے ہیں۔یہاں مینجر کے کردار میں بھٹو صاحب کی حکومت کا بیانیہ علامتی فضا میں ملفوف ہے۔جب پاکستان کے مشرقی پاکستان سے حالات زیادہ کشیدہ ہوئے اور دونوں کے درمیان معاہدہ یا مفاہمت کا کوئی راستہ نہ نکلا تو عوامی مزاحمت کے سلسلے میں بنگلہ دیشی قوم پر گولی چلائی گئی۔اس رد عمل سے نہ تو پاکستانی قوم رضا مند تھی اور نہ ہی بنگلہ دیشی قوم۔افسانہ نگار نے” سقوط ڈھاکہ“ کی وجوہات معلوم کرنے کی کوشش کی ہے۔انہوں نے درست طور پر قیام پاکستان کے ساتھ ساتھ ہی مذموم رسہ کشی کو اسی کے زوال اور ترقی معکوس کا سبب ٹھہرایا ہے۔افسانے کے آخر میں بیان کیا گیا ہے کہ اس تھیٹر میں آدمی سوال کرتا ہے کہ میں جب سے آیا ہوں نیا مینیجر آرہا ہے ہا اور نظام بدلتا جا رہا ہے۔اس کے ہم نشیں سے خاموش کرانے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ اپنی بے باکی کی بناءپر انتظامیہ کے تشدد کا نشانہ بنتا ہے۔اس کردار میں سماج کے ان لوگوں کی تصویر پیش کی گئی ہے جو ظلم کے آگے خاموش رہنے کے عادی نہیں بہادر ی اور جوانمردی سے باطل کے برسرپیکار آتے ہیں۔تاہم زیادہ دیر تک نہیں پاتے اور جلد ہی حکومتی جبر کا نشانہ بن جاتے ہیں۔

رشید امجد نے فنی مہارت کی بدولت پوری سیاسی تاریخ اس علامتی افسانے میں سمیٹ کر رکھ دی ہے۔صدیوں سے سیاست اور اقتدار کا یہ” کھیل“ رچایا جا رہا ہے جس میں عوام محض تماشائی بن کر خود کو لٹتا دیکھ رہی ہے۔

”سکرپٹ“ افسانہ بھی ہماری حکومتی رسہ کشی کی مذموم داستان بیان کرتا ہے۔یہاں سکرپٹ سے مراد ہر نئے آنے والے حکمران کا نیا منشور ہے۔ وہ نیا قانون ہے جس سے قوانین تقدیم منسوخ پاتے ہیں۔یہ کہانی ایسے ملکی نظام کی مضحکہ خیزطنزیہ داستان ہے۔جس کے آئین اور قوانین میں آئے دن تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔افسانہ میں کھیل سکرپٹ سے باہر ہونے اور ہر کردار کا مرضی کے مکالمے بولنے میں بھی عوام کا دلچپی لے کر تالیاں بجانا ان کے بھولے پن اور حماقت کا بیان ہے۔ایک ایسی قوم جو ہر آنے والے حکمران کو مسیحا جان کر اس کے نافذ کردہ قوانین پر” سمعنا واطعنا“ کی مہر ثبت کرتی ہے۔ کہانی کار کی یہ کہانی ملکی سٹیج پر کھیلے جانے والے حکومتی کھیل کا انتہائی دلچسپ موثر اور فکر انگیز علامتی پیرا یہ ءاظہار ہے۔پاکستان ایک بڑے نظریے کی بنیاد پر حاصل کیا گیا مگر افسوس کہ ہم نے اس نظریے سے انحراف کیا۔

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.6 No.1 2022

اس وطن کے حصول کے وقت بہت سے خواب سجائے گئے مگر ناکام مقتدرہ کے ہاتھوں اس ملک کی باگ ڈور آنے کی وجہ سے ہم مسلسل تنزلی ہی کی جانب چلے جا رہے ہیں۔قیام پاکستان کے وقت جو حالت اس سرزمین کی تھی اب اس سے بھی بدتر ہوگئی ہے۔ہر نیا حکمران ملکی مفاد کے کے نعرے لگا کر اقتدار کی کرسی حاصل کرتا ہے مگر چند دنوں میں ہی اپنا اصل رنگ وہ دکھانا شروع کر دیتا ہے۔یوں ملکی مفادذاتی مفاد میں منتقل ہو جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں غریب ،غریب تر اور امیر، امیر تر ہوتا جارہا ہے۔عوام سب کچھ چھن جانے کے باوجود بھی آئینی واصطلاحاتی ترمیم پر مسکوت ہے۔یہ کھیل ریاستی سطح پر مدتوں سے کھیلا جارہا ہے۔عوام شعور کی کمی کی بنا پر ہر کردار کے فعل کو سرا رہے ہیں اور پورا ہال تماشائیوں کی تالیوں سے گونج رہا ہے۔بقول احمد اعجاز:

”یہ بظاہر مختصر سی کہانی ہے مگر کہانی کار کے فن کی اعجازسے اس کا پھیلاؤ ایک قوم کی پوری تاریخ پر محیط ہو جاتا ہے۔چھوٹاسا اسٹیج پھیل کر ایک بڑے اسٹیج کا روپ دھار لیتا ہے جس پر ایک پوری قوم کئی سالوں سے کھیل، کھیل رہی ہے۔۔۔۔۔خوشی کے پورے احساس سے تباہی اور بربادی کا۔

ہر آنے والا حکمران اپنی مرضی سے حکومت چلانے کے لیے قانون اور آئین سے چھیڑ چھاڑ کرتا ہے۔اگر ہم اپنے ماضی پر نگاہ دوڑائیں تو ہم اس بات کا ادراک میں تردد نہیں ہوتا کہ سابقہ حکمرانوں میں بعض نے مختلف دفعات تبدیل کیں جبکہ بعض نے تھوڑی سی ترمیم کر کے اسے اپنے رنگ میں رنگا ۔آئین میں یہ بات شامل ہے کہ پاکستانی آئین کو منسوخ یا معطل کرنے والے کو پھانسی دی جائے مگر اس جگہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس والی بات ہے۔اگر عوام مرتکب ٹھہرے تو ان پر ان قوانین کا ضروراطلاق ہوگا مگر امیر لوگ ارتکاب کرے تو انہیں چھوٹ ہے۔انہی مسائل میں پسے ہوئے ایک عام آدمی کی بازگشت ہمیں رشید امجد کے افسانوں میں جابجا سنائی دیتی ہے۔افسانے کے آخر میں ایک کردار کھیل کی چھان بین کرتا دکھایا گیا ہے جو متلاشی ہے اس پہلو کا کہ کھیل میں گڑبڑ کہاں سے ہوئی ؟؟؟ یہ ملک کے ان دانشوروں کی طرف اشارہ ہے جو اس حقیقت کو سمجھتے ہیں کہ اگر آئین و قوانین یا اسکرپٹ کے بغیر اس کھیل کو چلانے کی کوشش کی گئی تو یہ کھیل محض مسخرہ پن بن کے رہ جائے گا۔اس سے مراد سماجی ادیب بھی ہو سکتے ہیں جنہوں نے(بشمول رشید امجد) جمہوریت و آمریت کے جبر و تسلط کو سماج کے سامنے رکھا۔

کھیل کے تماشائیوں میں ایک کردار ایسا بھی پیش کیا گیا ہے جو انگلی اٹھانے والوں کو منع کرتا ہے کہ کھیل ہو رہا ہے یہی بڑی بات ہے۔سکرپٹ کو چھوڑ۔اس سے وہ سماجی طبقہ مراد لیا گیا جو سیاست میں کلی طور پر دلچسپی نہیں لیتا۔وہ ہر آنے والے حکمران اور ترمیم شدہ آئین کو آنکھیں بند کرکے قبول کرتے ہیں۔

افسانہ ”بکھری ہوئی کہانی“ آمریت اور عوام کی بے بسی کی عکاسی کرتا ہے۔بکھری ہوءکہانی سے مراد بے نتیجہ یا انجام سے ماوراء کہانی ہے۔ایسا مسئلہ جو نسل در نسل ودیعت ہوتا رہتا ہے مگر قوم اس سے چھٹکارا پانے سے قاصر ہے۔علامتی انداز میں یہ افسانہ حکمرانوں کی چالبازی ،جبر و تسلط اور قوم کی بزدلی و بے بسی کا عکاس ہے۔ایک آدمی کا چپکے سے مدتوں سے خالی پڑی کرسی پر براجمان ہو کر سبھی سے پیالہ خون کا اپنے سرداری کی شہادت کے لیے طلب کرنا ۔انکار کرنے والوں کی فصلوں کا نہ صرف جلنا بلکہ اپنے رشتہ دار سے بھی لاتعلق ہو جانا۔اسیری کی ایسی داستان ہے جو عوام میں صدیوں سے راسخ ہے۔اجنبی کے مرنے پر اس کی پسلی سے دوسرے اجنبی کا نمودار ہو کر اس کی کرسی کو سنبھالنا ،فی الحقیقت ڈکٹیٹر شپ کی جانب اشارہ ہے۔یہ ان حکمرانوں کی کہانی ہے جو عوام کے چنیدہ نہیں بلکہ مارشل لاءکے ذریعے ان پر مسلط کیے جاتے ہیں۔چوروں کی طرح اجنبی کے کرسی پر بیٹھنے سے مراد کسی آمر کا نظام حکومت طاقت کے بل بوتے پر سنبھالنا ہے۔گواہی لینے سے مراد اپنی حکومت تسلیم کرانا جبکہ لہو کے پیالے پیش کیا جانا فی الحقیقت ان کے حقوق کے استحصال کا مظہر ہے۔رشید امجد نے اپنے اکثر افسانوں میں جبری حکومت ان کا مظالم اور عوام کی بے بسی و بزدلی کو بیان کیا ہے۔اس افسانے میں ان کا اپنا سیاسی عہد واضح جھلک رہا ہے۔ڈاکٹر شفیق انجم اس متعلق رقمطراز ہیں :

> ”رشید امجد کی کہانی کا فرد اپنے ماحول سے بے زار ہے اس ماحول میں سیاست اور خارج کے جبر کا رنگ نمایاں ہوتا جاتا ہے۔مارشل لاءکی بندشیں قید و بند کی صعوبتیں اور حکم زشباں بندی پر مبنی موضوعات رفتہ رفتہ ان کی کہانی پر چھانے لگتے ہیں۔یہاں انسان کی داخلی طاقتیں مفلوج بھی ہیں اور متحرک بھی۔“(10)

"بکھری ہوئی کہانی" میں بھی عوام کے کردار میں بیک وقت داخلی طاقتیںمفلوج اور متحرک دکھائی گئی ہیں۔جیسے اجنبی کی پسلی سے جب دوسرا اجنبی جنم لے کر باہر آتا ہے۔توس اسے ایک شخص سوال کرتا ہے کہ تو کون ہے اور کہاں سے آیا؟؟؟ یہ وہ متحرک قوت ہے جس کی بدولت اس کے خلاف مزاحمتی آواز بلند کرتے ہیں۔ایک آدمی کے اس جرات مندانہ سوال پر پورے قبیلے والوں کا اس سے لاتعلقی کا اعلان کرنا طاقت کے مفلوج ہونے کی واضح نشانی ہے۔اس کہانی میں کہانی کار نے بادشاہت، مملوکیت، آمریت اور جمہوریت کے کئی پرویزی حیلے بہانوں کو بے نقاب کیا ہے۔ جیسے ایک آدمی دوسرے اجنبی کے خلاف آواز بلند کرتا ہے تو وہ اسے نسل در نسل غلامی یاد دلاتا ہے۔

"اے اجنبی! جان کے تیرا اقتدار ختم ہوا۔اجنبی تلملا اٹھا۔۔۔۔۔۔کیا تم نہیں جانتے کہ میری اطاعت تم پر فرض کر دی گئی ہے؟ پھر ایک توقف کے بعد بولا۔میرے قریب آ کے میں تجھ پر مہربان ہوا۔میرے ساتھ ی نے یہ سن کر حیرت سے زمین پر تھوکا اور پھر کہنے لگا : میری آیتوں پر لعنت بھیجتا ہوں اور سن لے کے میں تیری اطاعت سے منحرف ہو تا ہوں۔"(۱۱)

یہاں دیکھا جا سکتا ہے کہ جب ایک آدمی اجنبی (آمر حکمران) کے خلاف بغاوت کا علم بلند کرتا ہے تو وہ اجنبی غصے ہو کر اسے کہتا ہے کہ میری اطاعت تم پر فرض کر دی گئی ہے۔یہ بادشاہت کا وہ قدیم نظریہ ہے جو عوام کے اذہان میں بٹھا دیا گیا تھا۔حکمران زمین پر اللہ کا نائب یا سایہ ہے۔لہذا اس کے ہر حکم کی تعمیل من و عن ضروری ہے۔بصورت دیگر منحرف، مردود اور منکر ٹھہرے گا۔تقدس کی یہ باڑ اس لئے لگائی گئی تھی تاکہ وہ بھی بادشاہ پر انگلی نہ اٹھائے۔بالکل ویسا تصور جو ہمیں کافکا کی کہانی "دستک" سے ملتا ہے دو بہن بھائی کسی امیر شہر کے دروازے پر فقط دستک دینے کی بنا پر جیل کی سزا کاٹتے ہیں۔وہ اس لئے کہ اگر دستک دینے کے حوالے سے غریب عوام میں اتنی جرات پیدا ہو گئی تو کل یہ حکام بالا کی من مانیوں کی بناءپر ان کے گریبان تک بآسانی رسائی حاصل کریں گے۔لہذا اٹھتی ہوئی آنکھ جبر و خوف سے اس قدر جھکا دی جائے کہ وہ خلاف عدل کام دیکھنے کی حسرت ہی نہ کرے۔

ایک عام آدمی کے اجنبی سے سوال کرنے پر اپنے ہی خاندان سے لاتعلق ہو جانا کی غلامی کی آخری حد کی عکاسی کرتا ہے۔اگر کوئی جوانمردی سے قوم کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرانے کے لئے میدان میں آ بھی جائے تو مذہبی رہنما جوشاہی دربار سے وابستہ ہوتے ان کے من گھڑت فتاوی ا س کے مانع آ جاتے۔یوں ظالم بادشاہ کو مسجد اور کلیسائوں سے بھی بھرپور حمایت ملتی تھی۔اس تناظر میں جلال الدین اکبر اور ضیاءالحق کی واضح مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔اکبری دربار زر خرید ملّا بادشاہ کی حمایت اور شریعت کے منافی فتاوی کا صدور کرتے۔ضیاءالحق کو بھی جبری طور پر اسلامی قوانین نافذ کرنے سے متعلق مذہبی رہنمائوں سے مکمل حمایت ملتی۔افسانے کا اخروی پیرا گراف عوام کی پہلی پرواضع دلالت کرتا ہے۔حکمران چین سے بادشاہت کے مزے لوٹتا ہے جبکہ رعایا نسل در نسل سچ اور جھوٹ میں تمیز کرتے کرتے عمر گنوا بیٹھتی ہے۔

"خزاں دبے پائوں آئی" کہانی بھی موضوعاتی حوالے سے"بکھری ہوئی کہانی" سے مماثلت رکھتی ہے "خزاں دبے پائوں آئی" سے مراد پر امن معاشرے میں ظلم و بربریت کا خاموشی سے وارد ہونا ہے۔کہانی کی پوری فضا علامتی ہے۔جس میں درج ذیل تین تاریخی منظر نامہ پیش کیے گئے ہیں۔

1۔۔قیام پاکستان کے بعد کا دور

2۔سقوط ڈھاکہ

3۔ڈکٹیٹر شپ، بالخصوص ضیائی آمریت

افسانے کے عنوان "خزاں دبے پائوں آئی" سے اس افسانے کے موضوعات کو سمجھا جاسکتا ہے۔خزاں یہاں علامت ہے ظلم و بربریت کی، آمریت اور جبری تسلط کی۔خزاں ایک ایسا موسم ہے جس سے سبزہ و ہریالی کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔درختوں کے پتے جھڑ جاتے ہیں اورپرندے نقل مکانی پر مجبور ہوجاتے ہیں۔قیام پاکستان کے حصول کے بعد یہ سمجھاگیا کہ مسلمانوں کو سکون میسر آئے گا اور وہ اپنی ایک الگ ریاست میں امن و امان سے رہیں گے۔ پاکستان بننے کا یہ خواب تو بہت اچھا تھا مگر اس کی تعبیر نہایت ہی بھیانک ثابت ہوئی۔وہاں ڈاکوؤں کی ڈاکہ زنی اور راہزنوں کی راہزنی سے خائف ہوکر مکینوں نے اپنے گھر چھوڑ دیے۔قتل و خون اور آگ کے دریا سے گزر کر پاکستان اپنی جان بچانے کی غرض سے آئے۔مگر یہاں کے رہبر اور ان کے مسیحا

بھی لٹیرے ثابت ہوئے۔رشید امجد جو کہ خود بھی کشمیر سے ہجرت کرکے پاکستان آئے۔ملک کی ابتر صورتحال براہ راست دیکھنے کا موقع ملا اور پھر اس سے بڑھ کر اپنی زندگی میں آمریت (مارشل لائ) کے چار ادوار(ایوب، یحییٰ،ضیائ، مشرف) دیکھنے کو ملے۔ان کے عہد میں جس طرح عوام پر ظلم و بربریت اور تشدد کی داستان رقم کی گئی ، رشید امجد نے بعینہ ان واقعات کو علامتی پیرائے اپنے افسانوں کا حصہ بنایا۔بقول ڈاکٹر زینت افشاں:

”ان کا یہ رویہ سقوط ڈھاکہ کے سانحہ کے سلسلے میں بھی بالکل نمایاں اور کھلا ہے۔وہ اس سانحے کے تمام اسرار سے واقف ہیں اور ذمہ داریوں کو بھی جانتے ہیں۔مگر اپنے علامت نگاری کے رویے کے سبب کھل کر اظہار نہیں کرتے۔تاہم چونکہ سیاسی حوالوں سے بیزار بھی ہیں ،لہٰذا اس واقعے کے پیش نظر انسانی المیے اور دکھوں کا بیان کھل کر کرتے ہیں۔ان کے متعدد افسانوں میں سقوط ڈھاکہ کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔ڈاکٹر رشید امجد چونکہ علامتی افسانہ لکھتے ہیں، اس لئے افراد، مقامات اور واقعات کا نام نہیں لکھتے، لہٰذا ان کے افسانوں میں سے باقاعدہ اس سانحے کی شناخت کے ساتھ کوئی اقتباس تلاش کرنا مشکل ہے۔"(۲۱)

”خزاں دبے پاؤں آئی“ افسانہ سکوت ڈھاکہ اور ڈکٹیٹرشپ کی کیفیات کی واضح ترجمانی کرتا ہے۔باغ سے مراد پاکستان ہے۔پرندوں کے چہچہانے، بلبلوں کے نغمہ زن ہونے اور پھولوں کی خوشبو بکھیرنے کے منظر نامے میں آمریت سے قبل کا پرامن دور حکومت ہے، وہ زمانہ جب اس وطن کے باسیوں نے ہندو

¶ں اور انگریزوں کے مظالم سے چھٹکارا پایا۔باغباں سے مراد اس دیس کے وہ دانشور باسی ہیں جنھیں گڑبڑ محسوس ہو رہی تھی مگر زمانی تقاضوں اور حکومتی جبر کی بدولت اپنی آواز بلند نہ کر پائے۔خزاں کے دبے پاؤں یا چپکے سے وارد ہونا حکام بالا کی چال بازی کی طرف اشارہ ہے۔آمر اقتدار میں آتے ہی ظلم کرنا شروع نہیں کر دیتے بلکہ پہل عوام سے خیر خواہی جتاتے ہیں تاکہ ان کا اعتماد حاصل کر سکیں۔جب جمہور عوام ان کی تائید کر دے تو پھر مٹھی بھر لوگوں کی بغاوت ہو بھی جائے تو کچھ معنی نہیں رکھتی۔حق اور سچ کے نام لیواؤں کو قتل کر کے نشان عبرت بنایا جاتا ہے۔

آمریت کے ادوار میں اگر صرف ہم ضیاءالحق کا دور حکومت دیکھیں تو واضح ہوتا ہے کہ اس نے جبراً عوام پر اسلام آرڈیننس کا اطلاق کیا۔اگر عوامی مزاحمت سامنے آئے بھی تو ظلم و تشدد کی ایسی داستان رقم کی کی پوری فضا میں سناٹا چھا گیا۔کہیں سے حق کی پاسداری میں آواز سنائی نہ دی۔ذیل کا متن عوام کی خاموشی ہے اور محافظان قوم کا عوام پر طاقت کے استعمال کے ردعمل کا مظہر ہے۔

”بس کوئوں کا بے ہنگم شور تھا درختوں کی اونچی چوٹیوں پر بیٹھی چیلیں تھیں جن کی صورتیں گدھوں جیسی ہو گئی تھیں۔۔۔کوے ذرا اوپر والی شاخوں پر اپنی بے ہنگم آوازوں کے ساتھ اپنے ہونے کا اعلان کر رہے ہیں۔اب اس نے باغ کی طرف دیکھا،تو پھول مہک تو رہے تھے، لیکن کوئی پراسرار خاموشی تھی اس مہک میں لہک نہیں تھی۔“۳۱

اونچی شاخوں چیلوں سے مراد حکام بالا، کووں کی بے ہنگم آوازوں سے مراد حفاظتی ادارے جو ہر حکمران کے تسلط میں رہے اور سچ کا پرچار کرنے والے لوگوں کو مار مار کر مسخ کر دیتے۔باغ کے اجاڑپن اور خاموشی فضا میں پاکستانی سرزمین کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔جب حق بات کی سزا موت ہو تو پھر بے بسی کے عالم میں قوم کی اکثریت چپ سادھ لیتی ہے۔طاہرہ اقبال اس سارے منظر نامے کی توضیح ان الفاظ میں کرتی ہیں۔

”یہ کون سا نگر ہے جہاں قبرستان جیسا خوفناک سکوت چھایا ہے۔جواب واضح ہے کہ یہ وہی نگر ہے جو بے بہا قربانیوں سے حاصل ہوا۔جو آرزو کا مسکن تھا، لیکن اب وہاں آرزوئوں کی جگہ حسرتوں کا بسیرا ہے۔جبر کی حکمرانی ہے جس کے پنجہ ستیز آزما میں جکڑی وہی عوام ہے جنھوں نے کبھی اس قیام کے خواب بنے تھے۔ قربانیاں دی تھی لیکن اس کے محافظ ہی اس کے غاصب اور لٹیرے بنتے چلے گئے۔“۴۱

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.6 No.1 2022

افسانہ میں گدھ کے گوشت نوچنے سے مراد مشرقی پاکستان کا علیحدہ ہو جانا ہے۔گوشت نچوانے سے اذیت اور بے بسی اس طور پر تھی کہ پاکستان کی جغرافیائی حدود میں کمی واقع ہونی تھی۔ مگر دکھ کا احساس اس لیے نہ تھا کہ سقوط ڈھاکہ کی وجوہات پاکستان کے لیے سودمند نہ تھیں۔ قیام پاکستان کے بعد جب اردو زبان کو قومی اور دفتری زبان کا درجہ دیا جانے لگا تو بنگلہ دیشی عوام نے اس کی بھرپور مخالفت کی۔وہ اردو کی بجائے بنگالی زبان کو دفتری وقومی درجہ دلوانے کے خواہاں تھے۔یہ ایسا مطالبہ تھا کہ جس کی کسی پاکستانی نے حمایت نہ کی۔سقوط ڈھاکہ کی دوسری بڑی وجہ حکمران کی تقرری تھی۔بنگلہ دیشی عوام اپنے منتخب نمائندہ کو تخت شاہی پر بیٹھا چاہتی تھی جبکہ پاکستانی قوم پاکستانی حکمران کو۔یہ دونوں مطالبات تنازعات کی شکل اختیار کر گئے یہاں تک کہ بنگلہ دیشی طلبا حمایت زبان میں مارے بھی گئے۔یہی کشمکش سکوت ڈھاکہ کا سبب بنی۔افسانہ نگار اس واردات کو زیر بحث افسانے میں علامتی انداز میں پیش کرتے ہیں ان کے مطابق اس سانحے نے قوم کی کمر توڑ کر رکھ دی۔

افسانہ کے آخر میں دکھایا گیا ہے کہ دیمک کی مانند دھند پیلاہٹوں نے سارے بھاگ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔درختوں کے پتوں اور ٹہنیوں پر چیونٹیاں ایسی دوڑ رہی تھیں جوں انہوں نے سب کچھ فتح کرلیا۔اس خوشی سے مراد عوام پر آمر یا حکمران کا تسلط اور قبضہ قائم ہونے پر منایا جانے والا فتح کا جشن ہے۔تاکہ پوری دنیا اس کی طاقت اور فتح سے باور ہوسکے۔افسانوی کردار کا اپنے بدن سے کیڑے مکوڑوں اور چیونٹیوں کو جھاڑنے کے باوجود ناکامی دینا غیور عوام کی ناکام مزاحمت کی نشانی ہے۔جو کوشش کرتی ہے حق کی آواز بلند کرنے کی مگر ریاستی قوت کے وہ زیر اثر دب جاتی ہے۔یہ وہ سیاجی اور سماجی حالات ہیں جن میں افسانہ نگار کے اپنے عہد کا دل دھڑکتا ہے۔

"ایک عام آدمی کے خواب" میں ایک عام آدمی کیوں کر ان خوابوں کی تعبیر پانے سے قاصر ہے؟ رشید اس کا سراغ بھی عوامی سطح پر لگاتے نظر آتے ہیں۔" افسانہ سفر نا سفری" انھی وجوہات پر بحث کرتا ہے۔سفر نا سفری"سے مراد ایسا سفر ہے جو بے سود اور بے منزل ہے۔علامتی انداز میں قوم کی زبوں حالی کا بیانیہ اس کہانی میں سامنے آتا ہے۔کس طرح ایک قوم روز ازل سے اب تک یکساں زندگی گزار رہی ہے۔سفر سے مراد زندگی کا سفر جو گردش ایام سے ہو کر ہمیں موت کے قریب کرتا جا رہا ہے۔نا سفری سے مراد ایک ہی دائرے میں گردش کرنا ہے۔اندھیرے سے مراد جہالت ، غربت ، مفلسی اور پسماندگی ہے۔جس میں ہم کئی دنوں سے زندگی گزار رہے ہیں مگر ہمیں اس کا احساس تک نہیں۔اس افسانے کو تاریخ کے تناظر میں دیکھیں تو زیادہ تفہیم واضح ہو سکتی ہے۔

کہانی میں جب آدمی بزرگ سے سوال کرتا ہے کہ یہاں تو اندھیرا ہے مگر آپ کو اس کا احساس کیسے ہوا کہ روشنی نامی کوئی شے بھی ہے ؟اس کا جواب وہ یوں دیتا ہے کہ باہر سے کسی نے آکر ہمیں بتایا تھا کہ جیسے تم روشنی سمجھ بیٹھے ہو فی الحقیقت یہ اندھیرا ہے۔اس بتانے والے سے سر سید کی شخصیت مراد ہے جس نے زمانے کی چال چلن دیکھی تو فوری جان گئے کہ مسلمانوں کو بھی ترقی کر کے آگے بڑھنے کی ضرورت ہے۔مسلمان ، مذہبی،سیاسی ،معاشی اور تہذیبی و ثقافتی سطح پر دوسری اقوام عالم کی نسبت بہت پیچھے تھے۔تعلیمی معیار یہ تھا کہ لوگ مساجد و مدارس تک ہی محدود تھے۔انہیں کچھ خبر نہ تھی کہ آنے والے دور میں زندگی کن باتوں کا تقاضہ کرے گی؟ دشمن کی چال سمجھنے کا بہترین ذریعہ ہے اس کی زبان اور علائم سے واقف ہونا ہے۔تعلیمی معیار سنوارنے کے لیے سرسید نے علی گڑھ سکول اور کالج تعمیر کرائے۔لوگوں کو دور جدید کے سانچے میں ڈھالنے کی تلقین کی مگر سبھی لوگ ان کے مخالف بن کر استہزا اڑنے لگے۔ان کے پاس بصارت تو تھی مگر بصیرت سے خالی تھے۔کان تو تھے مگر حقیقت کی بات قبول کرنے سے قاصر تھے۔اپنے فردا سے نہ آشنا ہو گئے۔بجائے اس کے کہ وہ کمربستہ ہو کر آنے والے زمانے کا مقابلہ کر سکتے، اپنے ماضی پر اکتفا کرکے تسلی دینے لگے۔فلاں کے پر دادا ،دادا ،باپ نے بھی ایسی ہی زندگی گزاری۔اب بیٹا کیوں کرنئی روش اپنائے۔یوں سر سید کے ہراٹھتے قدم کو قابل ستائش و قابل عمل سمجھنے کی بجائے اسے مضحکہ خیز گردانہ گیا۔افسانہ نگار اسی صورتحال کی یوں ترجمانی سفر نا سفری"افسانے میں کرتے ہیں۔

"گیت نگار کی آواز میں آنسو چھلک رہے تھے اندھیرا تو کبھی نہ کبھی ختم ہو ہی جاتا لیکن آنکھیں ہی نہ ہوں تو۔۔۔۔

یہ عجب انکشاف تھا کہ اس کی آنکھیں ہیں نہ کان، وہ رو بھی نہیں سکتا تو۔۔۔۔۔۔ہنس تو سکتا ہے

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022

اور غیر ارادی طور پر قہقہہ ایک فوارے کی طرح اس کے ہونٹوں سے پھوٹ نکلا۔"15

سائنس اور ٹیکنالوجی کی آنے کے باوجود بھی کئی علاقے ایسے ہیں جہاں اب بھی لوگ اندھیرے (جہالت) کی زندگی گزار رہے ہیں۔کسی کا باپ کسان ہے تو اس کا بیٹا بھی اس کے بعد کسان ہو گا۔مجید امجد کی نظم" پٹواری" کی طرح اس پسماندگی نسل در نسل انتقال کرتی چلی آ رہی ہے۔کہانی سفر نا سفری"میں بھی بے یقینی، خوف اور اندھیرے کی کیفیت نسل در نسل چلتی ہوئی دکھائی گئی ہے۔قوم کا المیہ ہے کہ وہ مفروضے پر ایمان کرتی ہے اور سچائی کو پس پشت ڈالتی ہے۔شے کو پرکھنے کے بجائے اسے فقط ٹٹول کر اپنی پسند و نا پسند کا اظہار کیا جاتا ہے۔ہمیں ماضی کی بجائے مستقبل کو سامنے رکھ کر اپنا امروز مسنوارناچاہئے۔ہم حال کے دکھڑے ماضی کے تناظر میں پرکھ کر فرد سنوارنے کی سعی کرتے ہیں۔جس کے نتیجے میں لمحہ موجود بھی ہماری دسترس سے نکل کر خراب ماضی کا حصہ بنتا چلا جارہا ہے۔رشید امجد حصول کی تردید کرتے ہیں۔ہمیں آباءکی تقلید کی بجائے یہ دیکھنا چاہیے کہ زمانہ کس چیز کا متقاضی ہے ،اپنی دنیا آپ پیدا کر کے بند ہونے کی مثال دیں تاکہ ہماری آنے والی نئی نسل کٹھن مراحل سے بچ سکے۔افسوس کی بات یہ ہے کہ زمانی جبر اور سماجی بے حسی نے رہبر و مسیحا کو بھی تاریخ کا مسافر بننے پر مجبور کر دیا۔

"دمِ واپسیں" میں بھی کہانی نویس یک رخی زندگی کو "کولہو کے بیل" سے تعبیر کر کے رد کرتے نظر آتے ہیں۔ایک بوڑھے آدمی کے کردار کے ذریعے پورے سماج کی عکاسی کی گئی ہے۔جو اجتماعی ترقی کی بجائے انفرادی ترقی پر نظر جمائے رکھتے ہیں پرانے زمانے میں لوگوں کے اندر احساس مروت اور رقیق القلبی تھے۔دوسروں کی خوشی کو اپنی خوشی اور ان کے غم کو اپنا غم سمجھتے ہوئے مداوا کرتے مگر اس مادیت پرستی نے انسان کو" کولہوکا بیل "بنا کر رکھ دیا۔جو اپنے ہی محور میں گردش کر سکتا باہر نہیں جا سکتا۔افسانہ نگار نے دم واپسیں کے عنوان کی مناسبت سے بوڑھے کردار کے اندر یہ احساس اس وقت پیدا کیے ہیں جب وہ اپنی زندگی زندگی سے بہت دور جب کہ موت کے بہت قریب آچکا ہے۔جوانی میں انسان بہت کچھ اپنے سماج کے لئے کر سکتا ہے مگر ذاتی اغراض اسے اپنے مفاد تک ہی محدود رکھتی ہیں۔انسان اشرف المخلوقات ہے کمال کی بات یہ نہیں کہ آپ اپنی زندگی گزارنے کے اچھے اسباب پیدا کر لیں بلکہ اعجاز کی بات تو یہ ہے کہ انسان دوسروں کے لیے جیے۔

اگر اپنی ضروریات ہی پورا کرنا مقصد حیات ہے تو پھر جانور بھی تو یہ کام کرتے ہیں۔اس صورت میں انسانی شرف کہاں رہ گیا؟ اس انسان افسانے میں بھی رشید امجد پہلی سڑک سے مراد دنیاوی زندگی جبکہ موڑ سے مراد موت لے کر انسان کو سماجی فلاح و بہبود کے لئے غور و فکر کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔

"ایک دن اور" افسانہ ماضی اور حال کی مختلف کیفیات کو بیان کرتا ہے۔جب انسان پر ذمہ داریوں کا بوجھ نہیں ہوتا تو اس وقت وہ بے فکر خوش طبع وسیع نظر اور مخلصانہ رویہ کا مالک ہوتا ہے۔اس کا اندر باہر ایک ہوتا ہے جیسا اپنے لیے سوچتا ہے ویسا ہی اپنے دوست کے لیے۔افسانہ میں کردارکے یونیورسٹی کے دنوں کا ذکر ہے کہ جب کیفے ٹیریا میں بیٹھے ہوئے اجتماعی و سماجی انقلاب لانے کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔سبھی کا مطمئع نظر ایک ہی تھا مگر وقت سب سے بڑا استاد ہے جو اپنے فیصلے خود کر آتا ہے۔پہل پوری دنیا میں انقلاب لانے کا مقصد سامنے تھا مگر جدا ہوتے ہیں سبھی اپنی اپنی زندگی میں انقلاب لانے کی فکر کرنے لگے۔کہانی کا مذکورہ موضوع عصر حاضر کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔لوگ اجتماعیت کی بجائے انفرادیت کے قائل ہیں۔ہر کوئی اپنی ساکھ برقرار رکھنے کے لئے کوشاں ہے مگر اجتماعی ساکھ اور پہچان ہر کسی کی توجہ نہیں ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہم بھرے مجمعے میں بھی خود کو تنہا محسوس کرتے ہیں۔رشید امجد انفرادی تلاش کے اسی ناکام سفر کی روداد اپنے افسانوں کا حصہ بناتے ہیں۔احمد جاوید اس متعلق رقمطراز ہیں۔

"رشید امجد کے تفکرات میں بنیادی تفکر خود اپنی تلاش ہے اس مقصد کے لیے اس کے ہاں خارج سے داخل اور داخل سے خارج کی طرف سفر کرنے کا عمل بڑی تیزی سے ہوتا رہتا ہے۔"16

وہ لوگ جو ستاروں کو نشان راہ دکھاتے تھے آج وہ بھی کسی مرد راہ داں کو ترس گئے ہیں۔بجائے اس کے کہ مشکلات کا خود مقابلہ کریں اور ظلمت کدوں میں اپنی اپنی شمع جلا کرتاریک راہوں کو روشن کر کے اوروں کے لیے روشنی مہیا کریں ،ہم کسی مسیحا کے منتظر ہیں کہ کوئی آسمان سے اترے اور ہمیں مشکلات کے بھنور سے باہر نکالے۔

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.6 No.1 2022

"پرانی آنکھوں سے دیکھنے کا آخری دن" میں جدت و قدامت کا موازنہ کر کے عہد حاضر کی مادیت پرست تہذیب سے نفرت کا اظہار کیا گیا ہے۔ایجادات و اخلاقیات کا موازنہ کر کے ایک طرف قاری کو نئے زمانے کے نئے تقاضوں اور اقدار سے ہم آہنگ ہونے کا درس دیا گیا ہے جبکہ دوسری طرف ہم نشیں کو کچل کر آگے بڑھنے کی ترقی سے بیزاری کا رویہ افسانہ نگار کا سامنے آتا ہے۔تبدیلی ایک مستقل چیز ہے جس سے قدامت پسندوں کے اقدام پر لڑ کھڑانے لگتے ہیں۔دنیاوی حقائق میں سے ایک اہم حقیقت یہ بھی ہے کہ معاشرہ ہر آن تبدیل ہورہا ہے مگر قدامت پسند نئے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں ہو پارہے۔حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اپنی اولاد کی تربیت ان کے زمانے کے مطابق کرو کیونکہ وہ اپنے زمانے کے لئے پیدا ہوئی تمہارے زمانے کے لئے نہیں۔آج جب نئی نسل اپنی زندگی کی ضروریات پوری کرنے کے لیے مروج نئے نظام پر عمل پیرا ہونے کی بات کریں تو انہیں پہلا نشتر تنقید یہ پیوست ہوتا ہے کہ یہ نہ تھا ہم نے یہ مطالبات کبھی نہ کیے تھے آج کی نسل نافرمان ہوگئی ہے اپنے لئے آسانی و آسائش کے ذرائع تلاش کر رہی ہے اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ وہ تو اس وقت زمانہ ان کا متقاضی نہ تھا لوگ ان سے واقف نہ تھے دوسرا یہ کہ اگر یہ وسائل ان کے زمانے میں ہوتے تو یقینا لوگ مطالبہ کرتے لہذا اپنے آپ کو قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی وقت اور زمانے کے ساتھ چلے مگر نہ وہ اپنا وقار بھی کھو بیٹھے گا اور لذّت زیست بھی۔

زیر بحث افسانہ کا دوسرا پہلو طنزیہ ہے جس میں جدت پسندی کے پس پردہ خود غرضی کو بیان کیا گیا ہے۔جدت سے سائنس اور ٹیکنالوجی میں جہاں زندگی کو سہل بنایا وہی محدود اور خود غرض بھی۔دور قدیم میں اگر چہ ٹریفک سگنل نہ تھے مگر قانون شکنی بھی نہ تھی۔ایک دوسرے کو کچل کر آگے بڑھنے کی جستجو بھی نہ تھی۔بھائی بھائی کو قتل کر رہا ہے ہر طرف عداوت و دشمنی کی آگ اپنے جوبن پر ہے۔دلون میں نفاق ہے مگر دوستانہ رویے سے لوگ پیش آتے ہیں۔اسی بنا پر افسانے کا اختتام کہانی کار نے اس طور پر کیا ہے کہ وہ نئی آنکھ بنوا کے بھی پرانی آنکھ کو ترجیح دیتا ہے۔جدیدیت کے طریقے سیکھ کر بھی قدامت میں ہی آسودگی سمجھتا ہے۔رشید امجد کی کہانی کا فرد اپنے ماحول سے بے زار ہے۔

" عشق نہ پچھے " افسانہ کی کہانی بھی قدیم تہذیب کے ساتھ ہاتھ جڑت اور نئی تہذیب سے بیزاری کا اظہار کرتی ہے کہانی کار اس تہذیب کو بیان کرتا ہے جس سے اس کی گہری وابستگی رہی۔

> '' اور اسے پرانا محلہ یاد آ گیا۔وہ تنگ سی لیکن محبت سے لبالب بھری گلی جو اسے بانہوں میں جکڑ لیتی تھی۔کلچے والے کی دوکان جہاں سے وہ روز صبح گرم کلچہ لیتا تھا۔اور وہ دودھ ، لسی کا بھرا گلاس سارا دن کیا تازگی رہتی تھی اور اب ڈبل روٹی کے سوکھے ٹکڑے اور بدوضع جام، لگتا ہے میٹھی موم کھا رہے ہیں۔"[17]

یہاں جدید کھانوں پر طنز سامنے آتا ہے جس قدر فطرت اور دیسی غذا

¶س سے دور جا رہے ہیں اسی قدر اپنی صحت کا معیار خراب کر رہے ہیں۔قدیم زمانہ میں اگرچہ غزائیں کم تھیں مگر آدمی قوی جثہ تھے۔اب جہاں کھانوں کی تعداد شمار میں آنے سے ماورا ہے اسی قدر صحت کا معیار زوال پذیر ہے اور گھر سے وابستگی کا ہے انہوں نے اپنے محلے کی گلیوں اور مکان سے محبت کا نقشہ کھینچ کر بے جان وجود کو جان بخشی ہے۔بقول احمد اعجاز؛

> " ہمارا کہانی کا بنیادی طور پر تہذیبی اور تمدنی اقدار کا معتمد ہے زیر نظر کہانی ہمیں دو طرح کے ذائقوں سے خراب کرتی ہے اول تہذیبی اور تمدنی اقدار کی بازیافت دعائیں بے جان وجود کو حقیقی وجود کی سطح بخشا۔"18

اس افسانہ کا کردار اپنے خاندان سے رسمی جوڑا تھا وابستگی رکھتا ہے اس کا اس رشتہ اور میلان اپنی مٹی سے ہے وہ اپنے اہل خانہ کے ساتھ رہ کے بھی اجنبی ہے اور ایک بڑے سے گھر میں رہنے کے باوجود بھی گھٹن محسوس کرتا ہے۔بیوی بچے اس کی کیفیات و احساسات کو سمجھ نہیں پاتے۔یہی مادیت پرستی کی

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.6 No.1 2022

علامت ہے۔اس کہانی کے ذریعے کہانی کار میں یہ بات قاری کو سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح سماج کے نئے رخ نے اسے ایسی مادی دنیا میں لا کھڑا کیا ہے۔جہاں اس کے سکھ اور جذبات کی کوئی قدروقیمت نہیں ہے۔"عکس دیدہ چراغ" میں بھی اسی سے ملتی جلتی کیفیات ایک کردار کی ہمارے سامنے آتی ہے۔ایسا کردار جس کی اپنے گھر سے اس قدر وابستگی ہے کہ گھر سے باہر اکیلا رات نہیں گزار سکتا۔اکیلا سونے کی کوشش کرے بھی تو ڈراؤنے خواب دیکھتا ہے۔اس افسانے کی دو جہتیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔پہلی جہت تو سماج صورتحال کو بیان کرتی ہے۔جب ہر طرف افراتفری اور بے چینی ہو باہر کے حالات ناقابل برداشت ہو تو آدمی خوف کے خول میں بنا لینے لگتا ہے جب اتنی قوت نہ ہو کہ زمانے کے کشیدگی اور مظالم کا جرات مندی سے مقابلہ ہو سکے تو پھر خوف کے خول میں بنا لے کر اپنے جینا کا ڈھنگ لگا لیتا ہے۔

کہانی نویس کی کہانی ایک ایسے شاخت ہوئے آدمی کی داستان ہے جو اپنے اندر بھی ہے اور باہر بھی زندہ بھی اور زندگی سے ماورا بھی ہے اور اگر کچھ ہوتا ہے شاہ رخ نے تمہاری اور ضبط بھی تو شخصیت کو ریزہ ریزہ کرتے ہیں افسانے کی دوسری جہت رشید امجد کی خود کی ذات کی عکاسی کرتی ہے جیسے اس افسانے میں پیش کردہ کردار کی نفسیات کی بلکہ میں رشید امجد کی خود نوشت سوانح عمری "تمنا بے تاب" سے ان کی اپنی زندگی میں بھی دکھائی دیتی ہے راقم اطروف کہتے ہیں؛

> " میری بچپن کا ایک اور خوف ایک نامعلوم تھا رات کو مجھے یوں لگتا جیسے کوئی کوئی میرا بازو کھینچ رہا ہے میں چیف تھا اور امی سے لپٹ جاتا یہ خوف زندگی بھر میرے ساتھ رہا میں رات کو کمرے میں اکیلا نہیں سو سکتا"19

افسانہ نگار نے بیک وقت اس افسانے میں سماج کا اور اپنے اندر موجود ماضی کا ڈر اور خوف جبکہ حال کی بے چینی سبھی کیفیات کو بیان کیا ہے۔

"پونے آدمی "کی کہانی میں انسان کی داخلی اور خارجی کیفیات کو علامتی پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے کہانی میں موجود کردار کو ہر بات پر روک ٹوک اور ڈانٹ ڈپٹ کا سامنا کرنا پڑتاہے۔ابتدا بلند آواز میں وہاحتجاج کرتا مگر دو چار بار کی پٹائی کے بعد اس نے بڑبڑانا شروع کر دیا۔ردعمل کے اظہار کا موقع ہاتھ میں نہ آنے پر اس کا ظاہر و باطن یکجا نہ ہوا۔یوں اس کی شخصیت ادھوری سی رہ گئی افسانے کا عنوان ہی کردار کے خلیات اور محرومی کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کی شخصیت میں خلا ہے ، تبھی کہانی کار نے اسے پونا آدمی کہا ہے۔پونے آدمی کی خواہش اور عادت کو جس قدر کم کرنے کی کوشش کی وہ اس قدر چرچڑاپن کا شکار ہوگیا۔پہلے پہل احتجاج اپنے بچوں کے لئے مزاحمتی انداز ،بڑبڑانا اور بالآخر اپنے اندر ایک جہان پیدا کر کے دنیا سے ماورا ہو جانا درحقیقت یہی وہ اسباب ہیں جو اولاد کے اندر شرمیلا پن اور بغاوت کو جنم دیتے ہیں۔جن امور سے پونے آدمی کو روکا جاتا وہ ظاہرا تو اس سے باز رہتا مگر کشیدگی کے عالم میں اسے انجام دے کر اپنا کتھارس بھی کر لیتا۔یوں سماج میں موجود ہر فرد کی دو رخی زندگی افسانہ نگار نے واضح کی ہے۔رشید امجد سماج کے ایسے کرداروں کو اپنے افسانوں میں پیش کرتے ہیں جن کا توازن زندگی برقرار نہیں۔کوئی اخلاقی زندگی میں شامل ہیں کبھی کردار ظاہر و باطن یکجا نہیں ہونے دیتا جبکہ کبھی معاشرہ اسے چہرے پر ماسک پہننے پر مجبور کردیتا ہے۔

"اپنے ہونے کا احساس اور نشر مراقبہ کے اعترافات کی کہانیاں دونوں افسانوں میں مرشد کا مرکزی کردار ہے اور رہبر کے استعارہ کے طور پر ہمارے سامنے آتا ہے یہ مرشد کا تصور ان کی اپنی نجی زندگی سے ان کی کہانیوں میں در آیا ہے مگر دونوں افسانوں کے موضوعات ایک دوسرے سے الگ ہیں۔

شب مراقبہ کی طرف آباد کی کہانیاں میں مرشد بنام کردار کو تصوف کی منازل طے کرنے کا پہلا زینہ نفی ذات یعنی اپنی "میں'' کو ختم کرنا بتاتا ہے اس کے برعکس اپنے ہونے کا احساس میں فلسفہ خودی خود اعتمادی اور خود شناسی کا درس سامنے آتا ہے رشید امجد خودی کو دو طریقوں سے بیان کرتے ہیں کہ خودی سے مراد خود آگہی جب کہ دوسری خودی کا تصور سے مراد مقصد حیات کی پہچان ہے اس احساس کو بیدار کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ وہ یہ جان سکیں کہ وہ ہے اور کچھ کرنے کی صلاحیت ضرور رکھتا ہے تبھی اسے اشرف المخلوقات کا درجہ دیا گیا اور ذات کا یہ موضوع رشید امجد کا ایک ایسا کل یہ ہے جو انتشار سے بھرپور معاشرہ میں وہ ایک فرد کے ہاتھوں میں تم آتے ہیں خود آگہی رشید امجد کے ہاں انسان کے وجود زندگی ایسی اندرونی قوت ہے جو

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.6 No.1 2022

اس پہاڑ سے ٹکرا کر پاش پاش کرنے کا حوصلہ دیتی ہے اور آمادہ کرتی ہے اپنے نصب العین پر نوٹ کر ان مقامات بلیک ہول کی طرف جانے سے گریزاں رہنا چاہیے جس جگہ اپنے ہونے کا احساس ختم ہو جانے کا اندیشہ ہو۔

شب مراکبہ کے اعترافات کی کہانیاں کا کردار اپنی نفی ذات سے ڈر کر وجود قائم کرنے رکھنے پر مصر ہے وہ سمندر کی تہہ میں اترنا چاہتا ہے مگر اس کی وسوسے بھی خواہش ہے سب پر توجہ مرکوز کرنے کے بجائے اس بات پر اپنی نگاہیں گاڑے ہوئے ہیں کلب کی پاکیزگی و تفسیر سے مطلوب تو ہے مگر عشق کی یاد میں سنتا گوارا نہیں وہ اپنی شناخت بنانا چاہتا ہے اپنا وجود کو نئی سمت کی طرف گامزن کرنے کے لیے پر عزم ہے مگر واپسی کی امید بھی رکھتا ہے ۔بقول ڈاکٹر ناصر عباس نیر:

> "یہ ظاہر لگتا ہے کہ رشید امجد کے عام آدمی نے اپنی شناخت کا بحران حل کر لیا ہے اور اپنی شناخت کے صرف یا تصور کی منزل پر کر لی ہے جس کا وہ ہمیشہ خواب دیکھتا رہا ہے مگر لگتا ہے کہ ان کا عام آدمی اپنے خوابوں کی کھڑکی کھلی رکھنا چاہتا ہے ایک ایسے زخم ایک ایسی صورتحال کو برقرار رکھنا چاہتا ہے جو اسے اس کی انسانی سطح پر قائم رکھے وہ وجود کی حد سے نکلنا چاہتا ہے مگر واپس بھی آنا چاہتا ہے صوفیانہ راستے کا مسافر بن کر پیغمبرانہ وصف اپنے اندرچاہتا ہے۔"20

مذکورہ رموز تصوف میں رشید امجد میں جدید فرد اس کی خواہشات اور مقاصد کو قاری کے سامنے رکھا ہے دور حاضر کا فرد اپنے طبی وجود اور ساخت سے نکلنے کے سفر میں الجھن کا شکار ہوتا ہے وہ الجھن موجود زمانے کے فرد کی ایک گہری وجودی رمزی ہے۔مرشد جب اس سے کہتا ہے کہ تم وجود کی نفی سے ڈرتے ہو تو وہ کہتا ہے کہ اپنے وجود سے نہیں بلکہ اپنے نہ ہونے کے احساس کا خوف لاحق ہے اپنے ہونے کا احساس اس لیے باقی رکھنا چاہتا ہوں کہ جاننے کا یہ سفر جاری رہے۔وہ بخوبی اس بات سے آگاہ ہے کہ جس سیمرغ کی تلاش اسے مائل کر رہی ہے وہ خود ہی ہے۔

" ایک عام آدمی کا خواب میں رومانوی اثرات بھی ہمارے سامنے آتے ہیں محبت کا تقدیر کے جبر سے لاچار ہونا اور موجودہ دور کی محبت تو نہیں تو اور سہی جیسے تصورات ہمارے سامنے آتے ہیں۔پسلی کا رشتہ افسانہ درج ذیل موضوعات بیان کرتا ہے

1۔تقدیر کا جبر فیصلہ

2۔والدین کا بیٹی کی رضامندی کے بغیر رشتہ طے کرنا

3۔مشرقی لڑکیوں کی اپنے والدین اور شوہر سے اسیروں کی طرح وفاداری و اطاعت شعاری سے پیش آنا۔

پسلی کا رشتہ اماں حوا اور آدم علیہ السلام کی بائیں پسلی سے پیدا ہونے کی طرف اشارہ ہے دنیا کا یہ پہلا جوڑا تھا جس میں احسن طریقے سے ایک دوسرے سے نبھا کیا ایک علامت اور تاج کے تناظر میں افسانہ نگار نے لڑکیوں کی رضامندی کے بغیر شادی لڑکیوں کے تعلیمی مرکز سلیم ہم کرنے کا علمی بیان کیا ہے۔شادی نام کی ایک رسم ادا ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ شادی کے موقع پر لڑکی کے والدین آپس میں جھگڑ رہے ہوتے ہیں کہ تقدیر ہمیں کیوں کر اس دن اس اجنبیوں کے گھر لے گئیں اور ہم نے رشتہ کرلیا۔عورت مرد کی پسلی سے جنم لیتی ہے اور برسوں بعد شادی سے تقدیر ان کے درمیان مزاجی مطابقت پیدا کر دیتی ہے عورت کے مزاج کے مطابق آپ کا انتظار آج کے پیچھے افسانہ نگار ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

> " معلوم نہیں میں تمہارا آئیڈیل ہو یا نہیں لیکن تم میری آئیڈیل ضرور ہوں اس وقت وہ کچھ نہ بولی کچھ دن بعد اس نے سوال کا جواب دیا کہنے لگی کی لڑکیاں پہلی رات جس کے ساتھ سفر کرتی ہیں وہیں ان کا آئیڈیل بن جاتا ہے۔"۱۲

آشنا نا آشنا میں بھی محبت کے راستے میں حائل کردہ سماجی کردار کا بیان ہے لڑکا اور لڑکی دونوں من پسند شادی کرنے کے خواہاں ہوتے ہیں مگر کبھی ذات پات کا مسئلہ آڑے آجاتا ہے تو کبھی جاہ و جلالت کا۔پریم کہانی دوراہے کا شکار ہوجاتی ہے مگر کہانی کا ریہاں نام نہاد محبت اور عاشق و معشوق کو بھی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں کہ اگرچہ آج ان کے درمیان جدائی پیدا کرتا ہے۔مگر حقیقت اور محبت جانبازی اور جانثاری کے تحت نہیں کرتے اگر سچی محبت

ہو تو پھر عاشق معشوق اور معشوق عاشق کے لیے اپنی جان سے گزرتی ہے مگر کسی اور کو اپنی زندگی میں آنے کی اجازت نہیں دیتے۔اب دین کے لوگ سچی محبت اور اور لگن سے عشق کرتے تھے عشق کی راہ میں حائل ہر رکاوٹ کو جان پر کھیل کر عبور کرتے مگر آج محبت ہے فقط ، عزت، مال شہرت اور وقار کی خاطر کی جاتی ہے۔پرانی محبتوں میں خلوص تھا اور اکٹھا رہنے کا جذبہ بھی۔تبھی فرہاد کا شیریں سے عشق پہاڑوں کے درمیان سے جوئے شہد نکلواتا ہے۔ ہیرؔ کی خاطر رانجھے نے بیس سال بھینسیں چرائیں۔سوہنی اپنے عاشق سے ملاقات کے لیے کچے گھڑے سے آشنا ہوتے ہوئے بھی سفر محبت کا عزم کرتی ہے۔

آج کی محبت کی بنیاد مادیت پرستی پہ استوار ہے۔افسانہ میں عرصہ میں بعد عاشق و محبوب کی ملاقات کے ذریعے دیکھا گیا ہے کہ لڑکی اس کے ساتھ رہنے کی حسرت پوری نہ ہونے پر اس کی محبت میں مرنے کے لئے تیار ہوتی ہے مگر اس کی منزل آنے پر جب رشتہ دار لینے آتے ہیں تو وہ چلی جاتی ہے اور ایک دوسرے کو تکتے رہتے ہیں محبت کے جذبات تو ان میں ہیں مگر ان حالات کا سامنا کرنے کی جرت وحوصلہ نہیں۔اکیسویں صدی کے باعث انہیں بھی خود کو زمانی تقاضوں کے مطابق ڈھالنا پڑتا ہے۔ہر شخص اپنی منزل کی جستجو میں ہے۔رشتے استوار تو ہوتے ہیں مگر پایا تکمیل تک نہیں پہنچ پاتے۔ہر فرد اجتماعیت کی بجائے انفرادی شناخت قائم کرنے پر تلا ہے مگر نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ اپنی ذاتی ساکھاور پہچان بھی برقرار نہیں رکھ پاتا یہی رشید امجد کے عام آدمی کے خواب ہیں اس کے لئے ان کا کردار ان کے افسانوں میں سرگرداں نظر آتا ہے۔

حوالہ جات

1۔ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، عالمگیریت اور اردو اور دیگر مضامین، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2015ئ، ص 301
2۔رشید امجد، ایک عام آدمی کے خواب، اسلام آباد: پورب اکادمی، 2010ء، ص: 3
3۔احمد اعجاز، رشید امجد کے منتخب افسانے، اسلام آباد: پورب اکادمی، 2009ئ، ص: 34
4۔صفیہ عباد، رشید امجد کے افسانوں کا فنی و فکری مطالعہ، اسلام آباد، پورب آکادمی، 2007ئ، ص: 91
5۔فردوس انور قاضی، ڈاکٹر، اردو افسانہ نگاری کے رجحانات، لاہور، مکتبہ عالیہ، 1999ئ،ص 562
6۔رشید امجد، ایک عام آدمی کا خواب، راولپنڈی، حرف اکادمی،2006ئ، 67
7۔ایضاً، ص: 100
8۔احمد جاوید، مرتبہ پاکستان میں اردو ادب کے پچاس سال، ڈاکٹر نوازش علی، راولپنڈی: گندھارا پبلشرز، 2005ئ، ص 279
9۔رشید امجد کے منتخب افسانے، ص: 36
10۔شفیق انجم، ڈاکٹر، ڈاکٹر رشید امجد شخصیت اور فن، اسلام آباد: اکادمی ادبیات، 2010ئ، ص: 200
11۔ایک عام آدمی کا خواب، ص:94
12۔زینت افشاں، ڈاکٹر، اردو فکشن پر سقوط ڈھاکہ کے اثرات، کراچی، ادارہ یادگار غالب، 2016ئ، ص: 269
13۔ایک عام آدمی کا خواب، ص: 76
14۔طاہرہ اقبال، پاکستانی اردو افسانہ سیاسی و تاریخی تناظر میں، لاہور: فکشن ہا¶س، 2015 ئ، ص 428
15۔ایک عام آدمی کا خواب، ص: 123
16۔احمد جاوید، مرتبہ پاکستان میں اردو ادب کے پچاس سال، ص: 275
17۔ایک عام آدمی کا خواب، ص:129
18۔رشید امجد کے منتخب افسانے، 37
19۔رشید امجد، تمنا بے تاب، راولپنڈی: حرف اکادمی، 2003 ءص: 15
20۔عالمگیریت اور اردو اور دیگر مضامین، ص 303
21۔ایک عام آدمی کا خواب، ص: 107